International Research Journal of Arabic and Islamic Studies, Vol.:04, Issue: 01, Jan-Jun 2024
pp:340 - 356

OPEN ACCESS
IRJAIS
ISSN (Online): 2789-4010
ISSN (Print): 2789-4002
www. irjais.com

مغربی استعماریت کے افکار و نظریات: ایک تحقیقی جائزہ

Western Colonial Thought and Ideologies: An Analytical Study

Muhammad Zubair
Ph.D. Scholar, Department of Islamic Studies,
The University of Lahore, Lahore.
Email: zubi.tbz@gmail.com
Dr. Saima
Assistant Professor, Department of Islamic Studies,
The University of Lahore, Lahore.
Email: saima@ais.uol.edu.pk

Abstract

Western colonialism is rooted in a specific mindset shaped by metaphysical beliefs, values, and ideologies. Its cultural superiority stems from intellectual dominance rather than military might alone. Historical evidence suggests that lasting supremacy requires intellectual foundations, and the decline of any civilization begins with their erosion. Muslims' lack of deep understanding of Western colonial thought has led to three major issues: failure of sincere Islamic movements, uncritical acceptance and attempted Islamization of Western ideas, and misinterpretation of the Enlightenment as an extension of Islamic thought. These misunderstandings perpetuate Western intellectual dominance. This study emphasizes the need for a unified approach among Islamic movements to intellectually dismantle Western colonialism. It highlights the inseparability of ideologies like liberalism and communitarianism from their specific historical, political, social, and economic contexts, arguing that adopting these without context leads to distortion. By understanding these ideologies comprehensively, it is possible to resist intellectual colonization effectively and uphold authentic Islamic principles.

Keywords: Colonialism, Intellectual, Dominance, Western Ideologies, Metaphysical Beliefs, Enlightenment, Liberalism, Islamization, Intellectual Resistance

تعارف موضوع

استعماری فکر چند جغرافیائی حد بندیوں کی مرہون منت نہیں، بلکہ کچھ خاص عقائد (مابعد الطبیعات) اقدار اور نظریات پر مبنی ایک مخصوص ذہنیت کی عکاس ہے۔ کسی بھی تہذیب میں انسان کا ایک خاص تصور اور مقام ہوتا ہے۔ اگر ا

CC BY

س تصور انسان کو اپنالیا جائے تو اس تہذیب کو علمی بنیادوں پر رد کرنا ناممکن ہو جاتا ہے مغرب استعمار کی تہذیبی برتری اس کی فکری برتری میں پنہاں ہے۔ کسی بھی تہذیبی غلبہ میں گو کہ عسکری عنصر کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا، لیکن تاریخ شاہد ہے کہ محض عسکری بنیادوں پر حاصل کردہ غلبہ زیادہ دیرپا نہیں ہوتا، کسی تہذیب کا زوال اس کی علمی بنیادوں کی شکست و ریخت کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔ مغربی استعمار کی فکری بنیادوں سے ناآشنائی کا خمیازہ ہم تین صورتوں میں بھگت رہے ہیں۔

1. مغربی استعمار کی فکری بنیادوں پر غلبہ اسلام کی کوششوں میں مصروف عمل انتہائی مخلص اور دیندار افراد اپنے مقاصد کے حصول میں شدید ناکامی سے دوچار ہوئے (اور مسلسل ناکام ہوتے جائیں گے کیونکہ شیشم کے درخت سے آموں کے پھل کی توقع عبث ہے۔) اور بتدریج اپنے اسلامی تشخص سے محروم ہوتے چلے گئے۔
2. مغربی استعمار کی فکر سے سطحی واقفیت رکھنے اور اس کی اساسی بنیادوں کو نہ جاننے کے باعث مغربی استعماری فکر کو ناقابل شکست تسلیم کرلیا گیا اور معذرت خواہانہ جواز پیش کرکے ہر مغربی خیال اور نظریے کو اسلامیانے (Islamization) کی کوشش کی جاتی رہی۔
3۔ مغربی استعماری فکر کی شکست و ریخت سے ناواقفیت کی بنیاد پر ہم میں سے اکثر دور تنویر کو اسلامی فکر کی ارتقائی شکل قرار دیتے ہیں، اور مغرب کی مادی ترقی کو اسلامی فکر کی مرہون منت گردانتے ہیں۔ اس طبقے کے افراد دور حاضر میں بھی اٹھارویں، انیسویں صدی کی مغربی استعماری فکر کا راگ الاپ رہے ہیں، اور اس علمی بحران سے بالکل ناآشنا ہیں۔ جس کے باعث مغربی استعماریت اپنی فکری بنیادوں مثلا اپنے مخصوص تصور انسان، تصور خیر اور مقصد حیات وغیرہ کو عقلی بنیادوں پر ثابت کرنے کی کوشش سے رجوع کرچکی ہے۔

ان حالات میں ہم ناچیزوں کی رائے میں مغربی استعماریت کو فکری بنیادوں پر اکھاڑ پھینکنے کے امکانات جتنے آج موجود ہیں پہلے کبھی نہ تھے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ غلبہ اسلام کی کوششوں میں مصروف عمل تمام قوتوں کو، خواہ وہ عسکری، معاشرتی، سماجی اور سیاسی نوعیت کی ہوں یا علمی فکری نوعیت کی، باہم ایک دوسرے سے مربوط کرکے ایک دھارے میں سمو دیا جائے۔ اور کسی ایک کے کام کو کسی دوسرے کے کام سے برتر ثابت کرنے کی کوشش نہ کی جائے۔ اور ہر کام کو غلبہ اسلام کے ہمہ وقتی اور آفاقی کام کا حصہ اور جزو سمجھا جائے۔

عقیدہ اور نظریہ میں فرق

دور حاضر کی اسلامی فکر کی یہ ایک عمومی کمزوری ہے، کہ وہ عقائد اور نظریات میں فرق نہیں کرپاتی، اور نظریات میں اختلاف کی بنیاد پر عقائد میں اختلاف کا قلم لگاتی ہے۔ عقائد سے مراد ایمانیات ہیں۔ اسلامی ایمانیات میں ایمان باللہ، ایمان بالرسالت، قبر، حشر، قیامت، جنت، دوزخ وغیرہ شامل ہیں۔ ان عقائد پر ایمان لانا مسلمان ہونے کیلئے لازم ہے۔ ہر وہ گروہ جو متذکرہ بالا عقائد پر ایمان نہیں رکھتا، کافر ہے اور اس کو کافر کہنا درست ہے۔

نظریات سے مراد "وہ تصورات ہیں جو عقائد کے اظہار کیلئے ضروری سمجھے جاتے ہیں"۔ مثلا مختلف حنفی مکاتب فکر میں عقائد اسلامی کے فروغ کے لئے یا ان رسوم ورواج کی ادائیگی کے بارے میں جو حضور ﷺ کی سنت سے ثابت نہیں لیکن جن کا شرع مطہرہ کے احکامات سے تصادم بھی نہیں، اختلاف ہے۔ یہ ایک نظریاتی اختلاف ہے، اعتقادی اختلاف نہیں اور اس نظریاتی اختلاف کی بنیاد پر کسی گروہ کو یا اس کے افراد کو دائرہ اسلام سے خارج قرار نہیں دیا جا سکتا۔

سرمایہ دارانہ نظام زندگی کے مختلف نظریات، قوم پرستی، سوشل ازم، لبرل ازم، سوشل ڈیموکریسی، اور انارک ازم وغیرہ یہ سب سرمایہ دارانہ نظریات اس لیے ہیں کیوں ان کے ماننے والوں کے عقائد ایک ہیں۔ وہ سب سرمایہ دارانہ عقائد پر ایمان لاتے ہیں۔(1)

استعماری فکر کا ارتقاء

مغربی استعماریت کا ارتقاء عیسائیت کی شکست وریخت کا نتیجہ ہے۔ عیسائیت میں خدا اور بندے کے باہمی تعلق کے لیے احکام موجود تھے، لیکن بندے کے بندے سے تعلق کے لیے واضح احکام موجود نہ تھے۔ لہذا سماجی اور قانونی ڈھانچے کی تشکیل کیلئے جو قوانین مرتب کیے گئے وہ بنیادی طور پر رومی قوانین (جو کہ بنیادی طور پر سیکولر نوعیت کے تھے) سے اخذ کردہ تھے۔ عیسائی فکر کی اس بنیادی کمزوری کے باعث ریاست اور معاشرہ کے مابین تصادم کا عنصر اپنی ابتدا سے ہی موجود تھا اور آگے چل کر خود مخلص عیسائی مفکر آگسٹین نے "City of God" کو "City of man" سے الگ کر کے سیکولر ازم کے لیے مضبوط جواز فراہم کر دیا۔ شادی نہ کرنا، رہبانیت، زائد عبادات وغیرہ، جس کے باعث گرجا سے وابستہ لوگوں (مرد و عورت) کے عام معاشرے سے کٹ جانے کی مذہبی بنیادیں موجود تھیں۔ اس غیر فطری طبقہ بندی کا نتیجہ طبقاتی کشمکش کی صورت میں برآمد ہوا۔

عیسائی علماء نے مذہب کی من مانی تعبیر و توضیح کے ذریعے عام فرد کو مذہب سے باغی کر دیا۔ کیتھولک چرچ کی برتری کا نتیجہ پروٹسٹنٹ ازم کی صورت میں برآمد ہوا۔ "مارٹن لوتھر" (پندرہویں اور سولہویں صدی) بذات خود ایک پادری تھا۔ اس نے "تحریک اصلاح" (پروٹسٹنٹ ازم) کی بنیاد رکھی۔ پروٹسٹنٹ ازم کے بنیادی نکات مندرجہ ذیل ہیں۔

1۔ ہر عیسائی کو بائبل کی تفسیر کرنے کا مکمل، یکساں اور مساوی حق حاصل ہے۔

2۔ خدا اور بندے کا باہمی تعلق حضرت عیسی علیہ سلام کی دوسری آمد تک ختم ہو چکا ہے۔

3۔ کسی کو کسی کے معاشرتی مرتبے کے تعین کا کوئی مذہبی استحقاق حاصل نہیں۔

4۔ لہذا دنیوی کامیابی کو اخروی کامیابی کا پیش خیمہ سمجھا جائے۔

ان اصولوں کی بنیاد پر جو اقداری اجزا معاشرتی طور پر ابھر کر سامنے آئے وہ حسب ذیل ہیں۔

1۔ آزادی 2۔ مساوات 3۔ عقلیت (Rationality) 4۔ ترقی

چونکہ ہر انسان یکساں طور پر عقل رکھتا ہے لہذا ہر ایک کو تفسیر انجیل کا مکمل، یکساں اور مساوی حق حاصل ہو گا۔ اور اخلاقی و روحانی تربیتی اقدار کا تھوڑا بہت اہتمام جو عیسائیت میں موجود تھا، اس کا بھی جنازہ نکل گیا۔ خدا سے تعلق ختم ہو جانے کے باعث معاشرتی مراتب کے تعین کی روحانی بنیادیں ختم ہو گئیں۔ اور اس کی جگہ مادی جاہ و حشمت قرب الٰہی کی نشانی سمجھا جانے لگا۔ یہی وجہ ہے کہ پروٹسٹنٹ ازم میں پوپ کی قوت بھی بادشاہ کے پاس ہی ہوتی ہے۔ اگر دنیاوی کامیابی ہی اخروی کامیابی کا پیش خیمہ ہے، تو سب سے زیادہ کامیاب انسان بادشاہ ہی تو ہوا۔ لہذا بادشاہ کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ جو چاہنا چاہے وہ چاہ سکتا ہے، اور کوئی اس سے انکار نہیں کر سکتا۔ بادشاہ کا یہی مقدس حق ایک پروٹسٹنٹ ریاست کی ابتدائی شکل میں سماجی اور قانونی ڈھانچے کی تشکیل نو میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے۔ آگے چل کر یہی مقدس حق کا تصور، مذہبی لبادے میں چھپے رومی اور یونانی سیکولر نظریات کے باعث ریاست کے مکمل طور سے سیکولرائز ہونے کا باعث بنا۔

اسی مقدس حق کے تصور نے دنیا میں حاکمیت الٰہی کے دروازے بند کر دیئے اور مسیحیت محض ایک انفرادی حیثیت میں خدا سے ایک خاص تعلق رکھنے کی حد تک محدود ہو گئی۔ بعد میں یہی "مقدس حق" ایک فرد یعنی بادشاہ سے لیکر تمام شہریوں یعنی Citizens میں یکساں تقسیم کر دیا گیا۔ پہلے خیر و شر کے تعین کا مطلق حق صرف ایک فرد یعنی بادشاہ کو حاصل تھا مگر بعد میں یہی حق شہریوں کی رائے کی بنیاد پر جانچا جانے لگا، جس کی موجودہ شکل جمہوریت کی صورت میں نے موجود ہے۔[(2)]

مغربی استعماریت کی فلسفیانہ بنیادیں:

گو کہ پروٹسٹنٹ ازم نے مغربی استعماری فکر کی ٹھوس بنیادیں فراہم کر دی تھیں۔ لیکن اس کے باوجود ہم پروٹسٹنٹ فکر کو استعماری فکر سے دو بنیادوں پر ممیز کر سکتے ہیں۔

1. پروٹسٹنٹ ازم کا مطلق نصاب انجیل کی صورت میں موجود ہے جبکہ مغربی استعماری فکر کا کوئی ایسا نصاب موجود نہیں۔
2. پروٹسٹنٹ فکر میں آزادی کا محدود تصور ہے۔ جب کہ مغربی استعماری فکر آزادی کے لامحدود تصور پر یقین رکھتی ہے۔

نصاب مطلق سے مراد یہ ہے کہ پروٹسٹنٹ فکر تفسیر انجیل کا حق ہر عیسائی کو دیتی ہے، لیکن کسی بھی مصدقہ تفسیر کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ انجیل ہی سے کی جائے، لہذا کسی نہ کسی طور پر وحی کی حیثیت برقرار رہی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ کوئی بھی پروٹسٹنٹ عقائد کا حامل فرد (خالص علمی بنیادوں پر) تفسیر انجیل کی بنیاد پر خدا کا انکار نہیں کر سکتا۔ یا مثال کے طور پر تفسیر انجیل کی بنیاد پر، لواطت کو جائز قرار دینا آسان نہیں ہے۔ جبکہ مغربی استعماری فکر کا چونکہ کوئی نصاب مطلق موجود نہیں ہے لہذا افلاح انسانیت کی کوئی بھی تفسیر و تعبیر کی جاسکتی ہے۔ اگر کسی جدید مفکر کے کام میں خدا کے وجود کی عقلی دلیل موجود ہے تو کسی دوسرے فلسفی کے کام میں خدا کے انکار کا بھی عقلی جواز موجود ہوتا ہے۔ اس طرح ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ پروٹسٹنٹ ازم گو کہ عیسائیت ہی کی بہت جدید شکل ہے۔ لیکن اس کے باوجود اس میں مطلق آزادی کے حصول

کے امکانات موجود نہیں۔یہی وجہ ہے کہ مغربی استعماری فکر سے عیسائیت کے یہ پروٹسٹنٹ بھی محفوظ نہ رہ سکے اور مغربی استعماری فکر ایک لادینی تہذیب کے ارتقاء کا سبب بنی۔[3]

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اصل چیز "اصلاح دین کی تحریک" ہے اور نشاۃ ثانیہ (Renaissances) اس کی ایک شاخ ہے جبکہ دوسرے گروہ کے نزدیک اصلاح دین کی یہ تحریک اور نشاۃ ثانیہ ساتھ ساتھ مل کر ایک لادینی تہذیب کے ارتقاء کا سبب بنیں۔

"ڈیکارٹ (Descartes)" کو ہم مغربی استعماری فکر کا بانی کہیں تو بے جانہ ہو گا۔ اس نے مغربی استعماری فکر کی علمیت کی حدود کا نہ صرف تعین کیا بلکہ بچی کچی مذہبیت کو بھی علمی بنیادوں پر اکھاڑ پھینکا۔اور ایک نئے اقداری ڈھانچے کے لیے علمی بنیادیں فراہم کیں۔ڈیکارٹ نے وجود انسان کے ادراک میں (Self-Knowledge) کی خالص عقلی دلیل دی،اس کے مطابق علمی اور عقلی بنیادوں پر کوئی بھی انسان اپنے علاوہ کسی بھی چیز خواہ وہ خیالات ہوں یا اقدار، معیارات خیر و شر ہوں یا وحی، اور چاہے خدا کا وجود، غرض کسی بھی چیز کا انکار کر سکتا ہے۔ڈیکارٹ کے نزدیک واحد قائم بذات سچ "میں سوچتا ہوں اس لیے میں ہوں ہی ہے"،یعنی میں اپنے اس دنیا میں ہونے کا جواز اپنے اندر رکھتا ہوں نا کہ کسی خالق کائنات کے وجود کی بنیاد پر (میں ہوں)۔ اسی طرح ڈیکارٹ نے ایک ایسی علمیت کی بنیاد رکھی جو کہ اولاً مابعد الطبعیات (وحی) سے ماوراتھی اور دوم ریب (Doubt) پر قائم تھی۔

عقل پرستی کے دور کا دوسرا بڑا امام نیوٹن ہے سائنس میں اس کا سب سے بڑا کارنامہ "کشش ثقل کے قوانین" کی دریافت ہے۔ مگر مغربی ذہن پر اس کا اثر بہت گہرا پڑا ہے یہ قانون معلوم کر کے گویا اس نے یہ دیکھا دیا کہ کائنات کا نظام چند واضح قوانین کے تحت چل رہا ہے اور اگر انسان اپنی عقل کی بنیاد پر یہ قوانین دریافت کر لے تو فطرت پر پورا قابو حاصل کر سکتا ہے قوانین دریافت کرنے میں وقت لگے گا لیکن انسان کو امید رکھنی چاہیے کہ وہ ایک دن فطرت کو فتح کر لے گا۔اٹھارویں صدی کا انگریز فلسفی ہیوم (Hume) ایک معاملے میں بڑی اہمیت رکھتا ہے اس نے کہا کہ ہر ایسے لفظ کو شک کی نظر سے دیکھنا چاہیے جو کسی ایسی چیز پر دلالت کرتا ہو جو کہ حسی تجربہ میں نہ ہو۔[4]

اس نے (مابعد الطبیعات) کی پوری عمارت کو ہی ڈھادیا تھا۔اور نئی علمیت (Modern Epistemology) کی بنیاد رکھی۔

انیسویں صدی کی استعماریت کی فکری اساس

اس زمانے سے دنیا پر مغربی استعمار کا سیاسی اور مادی غلبہ شروع ہوتا ہے اس صدی کے آخر تک سیاسی طور سے یا کم از کم معاشی طور سے ساری دنیا پر مغرب کی شہنشاہیت قائم ہو گئی تھی اور یہی دور سائنس کی ترقی اور ریل، تار برقی وغیرہ ایجادات کا ہے۔ جن کی مدد سے مغرب نے دنیا کو فتح کیا اور ذہنی طور پر بھی مرعوب کیا۔

خود مغرب میں یہ دور "صنعتی انقلاب" کا دور ہے یعنی مغرب میں معیشت کا انحصار زراعت پر نہیں رہا بلکہ صنعت اور کارخانہ داری پر ہو گیا۔ انیسویں صدی میں سرمایہ دارانہ نظام پوری طرح جم گیا۔ اس کے ساتھ ساتھ سرمایہ دار اور مزدور کے جھگڑے ہونے شروع ہوئے اور سرمایہ داری کے رد عمل کے طور پر نصف صدی کی بعد اشتراکیت کی تحریک شروع ہوئی۔

یہی وہ دور ہے جب مادیت مغرب کے ذہن پر پوری طرح حاوی ہو جاتی ہے۔ انیسویں صدی میں یہ بات طے ہو گئی کہ حسی اور مادی کائنات سے آگے کوئی چیز نہیں اس ہی مادیت کے رجحان کا دوسرا نام فطرت پرستی (naturalism) ہے۔ انیسویں صدی میں اخلاقیات کا ایک نیا نظریہ مقبول ہوا اسے افادیت پرستی (Utilitarianism) کہتے ہیں۔ افادیت پسندوں کے مطابق ایک ایسے معاشرے کی تشکیل ممکن ہے جس میں زیادہ سے زیادہ لوگ زیادہ سے زیادہ لذت حاصل کر سکتے ہیں۔ انیسویں صدی میں ایک اور اصطلاح بہت مقبول ہوئی۔ "آزاد خیالی" (Free Thought) اس کا مطلب ہے مذہب کی کھلم کھلا مخالفت کرنا، یا مذہب کے بارے میں شکوک و شبہات پیدا کرنا۔ (5)

انیسویں صدی میں جس چیز نے ایسی "آزاد خیالی" اور تشکیک کو سب سے زیادہ تقویت پہنچائی وہ انگریز سائنس دان ڈارون کا نظریہ ارتقاء تھا۔ اس نظریہ کا کوئی حتمی ثبوت ڈارون کو نہیں مل سکا تھا، اور نہ ابھی تک ملا ہے۔ یہ خالی نظریہ ہی نظریہ تھا، بحر حال یہ نظریہ مذہبی عقیدہ کی طرح جڑ پکڑ گیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ نہ تو کائنات ایک دم سے وجود میں آئی ہے نہ انسان، بلکہ کائنات کی ہر چیز اور انسان اپنی موجودہ ہیئت تک لاکھوں سال کی تبدیلیوں سے کے بعد پہنچا ہے۔ اس نظریہ نے لوگوں کے دل میں مذہب کی طرف سے شدید شک اور بدگمانی پیدا کر دی۔

ڈارون کا نظریہ غلط ہو یا صحیح، یہ جادو کا سا کام کر گیا، اور اپنے اخلاقیاتی فلسفانہ مفہوم کی بنا پر نظریہ فوراً مقبول اور ہر دل عزیز ہو گیا۔ انیسویں صدی میں صنعت اور سائنس نے نئی نئی ترقی کی تھی جس سے لوگ خوش تھے اور جس پر فخر کرتے تھے۔ اس لیے لوگوں نے ڈارون کے نظریہ سے یہ غیر منطقی نتیجہ نکالا کہ فطرت کے قوانین نے ہزاروں قسم کے جانوروں کو پیدا کیا اور پھر ہلاک کر دیا، بس انسان ایک ایسا جاندار ہے جو برابر ترقی کرتا چلا آرہا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فطرت انسان پر بہت مہربان ہے، اور یہ مہربانی آئندہ بھی جاری رہے گی۔ پھر یہ ترقی صرف مادی ہی نہیں بلکہ اخلاقی ذہنی اور تہذیبی بھی ہو گی۔ غرض انسان ہمیشہ سے ہر معنی میں ترقی کرتا چلا آرہا ہے اور ہمیشہ اس طرح ترقی کرتا رہے گا اس لیے انسان کا فرض ہے کہ اپنی تمام طاقتیں ترقی کے کام میں لگا دے۔ (6)

سیاسی اعتبار سے انیسویں صدی جمہوریت اور جمہوری اداروں کے عروج کا زمانہ ہے۔ اسی دور میں "عام آدمی" نے اپنی اہمیت جتانی شروع کی اور یہ مطالبہ ہونے لگا کہ ہر معاملے میں عام آدمی کی ضرورتوں کا لحاظ رکھا جائے۔

یوں تو مغربی استعماری فکر کی کوئی ایک تعریف موجود نہیں، لیکن انیسویں صدی کے آخر تک پیدا ہونی والی مغربی استعماری فکر کے متعلق چند بنیادی نکات مندرجہ ذیل ہیں۔

1. انسان کائنات کا مرکز و محور ہے۔(Anthropocentricity)
2. آزادی، بنیادی آئیڈیل ہے۔
3. مساوات، بنیادی قدر ہے۔
4. عقلیت، بحیثیت معیار۔ (Reason is the criterion)

مغربی استعماری فکر نے چونکہ علمی بنیادوں پر صرف اور صرف وجود انسانی کو ہر شک و شبہے سے عاری پایا تھا۔ چنانچہ کائنات کو صرف اور صرف انسانی پیمانوں پر پرکھنا ہی علمیت کی میراث قرار پایا۔ اور انسان پرستی (ہیومنزم) کو اقداری ڈھانچے میں کلیدی اور قطعی حیثیت حاصل ہوگئی۔ دوسرے تمام مغربی مفکرین کے یہاں اس بات پر اجماع نظر آتا ہے کہ انسان آزاد تو ہے ہی، سوال یہ ہے کہ اس آزادی کے دائرے کو کس طرح زیادہ سے زیادہ بڑھایا جائے۔اس طرح آزادی کی بڑھوتری ہی انسانیت کی معراج قرار پائی۔(7)

عقل پرستی کا تصور:(concept of rationality)

چونکہ مغربی استعماری فکر میں انسانی ذات کی اساس اس کی عقلیت میں پنہاں ہے، لہذا ہر انسان برابر ہے، اور عقلیت ہی خیر و شر کے پرکھنے کا واحد ذریعہ ہے۔ عقل کی بنیاد پر قطعی اور آفاقی سچ کا حصول ممکن ہے۔ جب انسان کو ہی تمام خیر و شر کے تعین کا حق حاصل ہے تو ایسی صورت میں خدا پرستی کا کیا سوال؟

حقیقتاً دیکھا جائے تو مغربی استعماری فکر نے خدا کی جگہ ایک (rational) عقل پرست شخص کو بیٹھا دیا ہے۔ مغربی استعماری فکر نے انسان کو خدا اور دنیا میں جنت بنانے کی ایک شعوری اور عملی کوشش کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مغربی استعماری فکر کے کسی بھی مفکر کے کام کو اٹھا کر دیکھیں، تو اس میں کہیں بھی کائنات کے دائمی ہونے کی نفی نہیں ملتی۔ اگر اس دنیا کو کبھی فنا نہیں ہونا ہے تو پھر انسان کی زندگی کا مقصد اس کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ دنیا میں اپنے قیام کو طویل اور پرلطف بنانے کی کوشش کرے۔

ماڈرنسٹ علمیت جس کلمہ پر لوگوں کو جمع کر رہی ہے، وہ انسان پرستی کے علاوہ کچھ نہیں کہ: "لا الہ الا الانسان" یعنی نہیں کوئی معبود سوائے انسان کے، اس صورت میں خدا پرستی کا گمان خارج از امکان ہے۔ حادثاتی طور پر تو مغرب پسند معاشرے میں خدا پرستی ممکن ہے، مگر اس کی کوئی علمی بنیاد پوری جدید فکر میں کہیں نہیں ملتی۔(8)

مغربی استعماری فکر میں انسان پرستی کی بہت سی شکلیں موجود ہیں۔ یہاں پر ہم صرف دو سے بحث کریں گے۔ 1۔ لبرل ازم 2۔ کمیونیٹیرینیزم۔

16ویں صدی کے بعد یورپ میں دو ہمہ گیر تحاریک کو فروغ ملا، یہ دونوں تحریکیں (اینلائٹمنٹ اور رومانٹسزم) عیسائیت کو مکمل رد کرتی تھیں۔ اور ایک نیا تصور انسان و کائنات اور نیا مقصد حیات پیش کرتی تھیں۔ ان دونوں تحریکوں نے انسانی ترقی کو اس بات پر منحصر قرار دیا کہ انسان کو کتنا آزاد ہونا چاہیے۔ ان دونوں تحریکات نے آزادی کو بنیادی قدر اور ہدف کی حیثیت سے قبول کیا۔

کمیونیٹیرین ازم اور لبرل ازم دراصل اینلائٹمنٹ اور رومانویت کی تحاریک کے جانشین نظریات ہیں۔ لبرل ازم اور کمیونیٹیرین ازم میں اہم ترین قدر مشترک یہ ہے کہ دونوں آزادی کو افضل ترین مقصود کے طور پر تسلیم کرتے ہیں۔ دونوں کا اس بات پر ایمان راسخ ہے کہ کسی بھی معاشرے کے قیام اور وجود کا اہم ترین کلیدی مقصد "حصول آزادی" ہے۔ آزادی دراصل "مقصود بالذات" ہے نہ کہ خدا پرستی اور رضائے الٰہی کا حصول۔ دونوں نظریات آزادی سے یہی مراد لیتے ہیں کہ انسان جو چاہے وہ حاصل کر سکے اور حصول لذات کی راہ میں مادی اور معاشرتی قیود یکسر ختم ہو جائیں۔[9]

لبرل ازم کا فروغ 16 صدی میں ہونا شروع ہوا۔ اور اس کا غلبہ انقلاب فرانس (1790ء) کے بعد تمام مغرب میں قائم ہوا۔ لبرل ازم کا دعوی تھا کہ جب عیسائی قدروں کی معاشرتی گرفت کمزور ہو گی اور معاشرے کی تربیت عقلی اور سیاسی بنیادوں پر کی جائیگی، تو حصول آزادی آسان سے آسان تر ہوتا جائے گا۔ اور ہر شخص اپنی انفرادی حیثیت میں اپنے خیر وشر کے معیارات کا تعین کر سکنے کے ساتھ ساتھ اپنی خواہشات با آسانی پورا کر سکے گا۔ کمیونیٹیریز کے نزدیک افراد خیر وشر کے معیارات کا تعین اپنے اغراض و میلانات کی بنیاد پر کرنے کے مکلف نہیں بلکہ خیر وشر کے معیارات کا تعین نوع انسانی کی مجموعی انسانی دنیاوی اغراض کو سامنے رکھ کر کرنا چاہیے۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ لبرل ازم میں "فرد اپنی الوہیت کے اظہار کا تنہا مکلف ہے"۔ جبکہ کمیونیٹیرین ازم کی فکر میں "انسان بحیثیت نوع کے کلاس یا قوم و نسل کے اپنی الوہیت کے اظہار کا حق رکھتے ہیں"۔ یہی وجہ ہے کہ قوم پرستی اور سوشل ازم (کمیونیٹیریزم) ہی کی اضافیت (Extension) ہیں۔

گو کہ لبرل ازم اور کمیونیٹیریزم فکر میں آزادی بنیادی قدر ہے اور دونوں ہی فکریں بنیادی طور پر "انسان پرست" (Humanist) ہیں۔ لیکن لبرل اور کمیونیٹیرین آزادی کے مختلف تصورات پر یقین رکھتے ہیں۔ اس فرق کو نا سمجھنے کی بنیاد پر بہت سی خالص مذہبی تحریکیں سوشل ازم اور قوم پرستی کا شکار ہوتی نظر آتی ہیں۔

آزادی (freedom) کیا ہے

آزادی سے مراد یہ ہے کہ انسان اپنے خیر وشر کے معیارات کے تعین کا نہ صرف خود مجاز بلکہ حقدار ہے۔ اور اس کی انسانیت کا جوہر ہی یہ ہے کہ وہ اپنی آزادانہ متعین کردہ اقدار کو اپنا سکے۔ اور ان کے مطابق اپنی زندگی گزار سکے۔ اسکا بہترین اظہار ہمیں مغربی مفکر "کانٹ (Kant)" سے ملتا ہے جو انسان کو مقصود بالذات (End in Himself) قرار دیتا

ہے۔ وہ ایک جگہ کہتا ہے: "کہ کوئی بھی کام یہ سوچ کر نہ کرو کہ تم ذریعہ ہو بلکہ ہر کام یہ سوچ کر کرو کہ تم ہر چیز کا مقصد ہو"۔(10)

مغربی مفکرین نے آزادی کی دو اقسام بیان کی ہیں۔ 1۔ آزادی کا منفی تصور 2۔ آزادی کا مثبت تصور۔

آزادی کا منفی تصور:(negative conception of freedom)

آزادی کا منفی تصور یہ ہے کہ معاشرہ جو ناگزیر پابندیاں لگاتا ہے، اس کے باوجود انسان کے پاس ایسا علاقہ بچ رہنا چاہیے جس میں وہ اپنی خدائی کا اظہار کرنے کا موقع رکھتا ہو۔ اور اپنے متعین کردہ اصولوں کے مطابق زندگی گزار سکے۔ آزادی کے منفی تصور میں اس بات سے بحث نہیں کی جاتی کہ انسان اس دائرہ کار میں کس قسم کی زندگی گزارے گا؟ بلکہ اس بات پر زور دیا جاتا ہے کہ معاشرتی اور ریاستی جکڑ بندیوں کے درمیان، ایسا علاقہ ضرور بچ رہنا چاہیے جس میں انسان جو چاہنا چاہے وہ چاہ سکے اور کر بھی گزرے۔ اور اس معاملے میں کسی کے سامنے جواب دہ نہ ہو۔ وہ اس علاقے میں چاہے کچھ بھی کرے، یہ وہ مقدس حق ہے جس کے اندر کوئی مداخلت نہیں کر سکتا۔ یاد رہے کہ اس مقدس حق کی مذہبی بنیاد ہمیں مسیحیت کے پروٹسٹنٹ دھڑے میں واضح طور پر ملتی ہے جس کا ذکر ہم پہلے کر آئے ہیں۔ انفرادی حقوق کا سارا معاملہ اس مقدس حق آزادی کا تحفظ ہے۔ جس میں آزادی فکر و نظر، حق وملکیت، اظہار رائے وغیرہ شامل ہیں۔ آزادی کے اس تصور کے نتیجے میں پبلک اور پرائیوٹ زندگی کا فرق پیدا ہوتا ہے۔ یعنی اس تصور کے مطابق فرد اپنی نجی زندگی میں کسی کو مداخلت کا حق نہیں دیتا۔ مقصود یہی ہے کہ فرد کی آزادی زیادہ سے زیادہ ممکنہ حد تک وسیع ہوتی چلی جائے۔ تاکہ اس کی "خدائی" میں اضافہ ہو سکے۔ منفی تصور آزادی سے اخذ کردہ چند اہم نتائج مندرجہ ذیل ہیں۔

1. اس بحث سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ آزادی در حقیقت کچھ نہیں، یہ صرف وہ علاقہ ہے جہاں انسان جو کچھ چاہے کر گزرے۔ خود آزادی کچھ نہیں ہے۔ اس کی کوئی اصل نہیں ہے۔ بلکہ اس کی اصل نفسانیت اور نفسانی خواہشات سے پُر ہونا ہے۔
2. آزادی اقدار کی نفی ہے، کیونکہ جب آپ کہیں گے کہ آزادی ایک ایسا علاقہ ہے کہ جہاں آپ جو چاہیں چاہ سکیں اور کر بھی گزریں اور جو آپ کر گزریں وہی حق ہے۔ تو اقدار کی بحث ہی بے معنی ہو جاتی ہے۔ ہر شخص قدر خود متعین کرتا ہے۔ حالانکہ قدر کی تعریف ہی یہ ہے کہ "جس کا پیمانہ انسان کی ذات نہیں بلکہ خارجی اور معروضی ہو"۔ اگر ہر شے اور خواہش کی قدر یکساں ہے تو فی الحقیقت کسی شے کی کوئی قدر نہیں۔
3. آزادی کے منفی تصور سے متصل تصور "اقدار کے تعدد" یعنی (Plurality of values) کا ہے۔ یعنی میری متعین کردہ قدر کسی بھی متعین کردہ قدر کے برابر ہے۔ اس سے یہ بات واضح طور پر نکلتی ہے کہ ترتیب اقدار ناممکن ہے۔ کیونکہ ہر شخص کی متعین کردہ اقدار یکساں اہمیت کی حامل ہیں۔ اقدار کی فوقیت صرف "ارتکاز

قوت" (کثرت رائے یا کثرت مال) سے قائم کی جاسکتی ہے۔ اور اس فوقیت کا کوئی نظری جواز پیش نہیں کیا جاسکتا۔ اور سب سے اہم مقدس حق کا یہ تصور عیسائیت کی مسخ شدہ شکل سے اخذ کردہ ہے۔

آزادی کا مثبت تصور: (positive conception of freedom)

لبرل ازم کے برعکس کمیونیٹیرئین ازم آزادی کا ایک مثبت تصور پیش کرتا ہے۔ اس کے خیال میں عقل ہمیں بتاسکتی ہے کہ آزاد ہونے کا کیا طریقہ ہے۔ اس سلسلے میں روسو، ہیگل اور مارکس نے مثبت آزادی کے مختلف تصورات بیان کیے ہیں۔ اس تصور آزادی کا حصول ایسے معاشرتی نظام میں ممکن ہے اس کے نتیجے میں انسانیت بحیثیت نوع کے خدا بن سکے۔ اس تصور میں آزادی کا اظہار انفرادی حیثیت کے بجائے افراد بحیثیت نوع یا قوم یا کلاس کے اجتماعیت میں کرتے ہیں۔ اس تصور آزادی کے حصول کیلئے لازما فرد کو اپنی انفرادی آزادی، اجتماعی آزادی کے حصول کیلئے قربان کرنا پڑتی ہے۔ جس کے باعث اظہار آزادی کے ذریعے انسانیت بحیثیت نوع کے اپنی الوہیت کا ادارک کرنے کے قابل ہوسکتی ہے۔

"روسو" کے نزدیک ایک معاہدہ عمرانی کے ذریعے ایک ایسے انقلابی معاشرے کے قیام کا امکان موجود ہے جس کے ذریعے آزادی کا حصول ممکن ہے۔ "مارکس" کے مطابق طبقاتی کشمکش کے ذریعے انسانیت بحیثیت نوع کے خدا بن سکتی ہے۔ کمیونیٹیرئین ازم جس تعقل کو بنیاد بنا کر مثبت آزادی کو متشکل کرنے کا دعویدار ہے وہ بھی خواہشات کا غلام ہے۔ اور اقدار کی آفاقی اور مستقل ترتیب کرنے سے قاصر ہے۔ اس تصور آزادی کو کمیونیٹیرئین ازم نے مختلف شکلوں میں الگ الگ طرح سے آشکار کرنے کی کوشش کی ہے، مگر ہم یہاں صرف دو اقسام سے بحث کریں گے۔

1۔ اشتراکیت (Socialism) 2۔ قوم پرستی (Nationalism)

(Socialism) اشتراکی نظریہ کے مطابق پرولتاری یعنی مزدور طبقہ واحد "آفاقی طبقہ" ہے۔ اور اس کے اغراض اور مفادات انسانیت کے اصل اغراض و مقاصد ہیں۔ لہذا معیارات خیر و شر کو پرولتاری طبقہ کے اغراض کی بنیاد پر متعین کرنا چاہیے۔ اس طرح نوع انسانی کی مجموعی آزادی میں زیادہ سے زیادہ اضافہ ہوسکے۔ سوشلسٹ کے نزدیک پہننے کے کپڑے، گھر کا فرنیچر، استعمال کے برتن اور اس طرح کی دوسری چیزیں اگر انفرادی ملکیت میں رہیں تو مظائقہ نہیں مگر مشین، زمین اور دوسری چیزیں جن سے دولت کی پیداوار ہوتی ہے، ان پر تو افراد کے مالکانہ حقوق ہرگز قائم نہیں رہنے چاہیں۔ (11)

قوم پرستی جزوی طور پر اس بات کا موقع فراہم کرتی ہے کہ لوگ اپنے اعلیٰ وارفع جذبات کا اظہار اجتماعیت میں کریں قوم پرستی کی دو بنیادی اقسام (Forms) ہیں۔

1. (Civil Grounded nationalism) کے تصور میں تمام افراد کسی خاص مملکت کے شہری ہونے کی بنیاد پر ایک ہی اکائی کا حصہ تصور کیے جاتے ہیں۔اور اس اشتراک عمل کا قوم کی اجتماعی آزادی کی بڑھوتری اور زیادہ سے زیادہ مادی وسائل و قوت کا ارتکاز ہے۔
2. (Ethical/Racial ground nationalism) کے تصور میں تمام افراد ایک نسل سے تعلق رکھنے کی بنیاد پر ایک اکائی کا حصہ تصور کیے جاتے ہیں لیکن مقاصد کے حوالے سے دونوں تصور قوم پرستی ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔

قوم پرستی بظاہر یہ موقع فراہم کرتی ہے کہ لوگ اپنے انفرادی مفادات پر جان قربان کرنے کو تیار ہو جائیں گے، اس لئے قوم پرستی کی بنیاد پر افراد اپنے اعلیٰ وارفع جذبات کا اظہار کریں۔ ہر قوم پرست کا مقصد اور ہدف اپنی قوم کے لیے قوت میں اضافہ ہوتا ہے۔ قوت کا یہ اضافہ پیمانہ معیار خیر وشر بن جاتا ہے۔اور افراد کے اندر اس قسم کے جذبات پروان چڑھتے ہیں کہ وہ چیز حق ہے جو سندھی، مہاجر، پٹھان، پنجابی، جرمن یا امریکی قوم کی قوت میں اضافہ کا باعث ہو۔ ہر وہ چیز حق ہے جو پاکستان کی قوت میں اضافہ کا باعث ہو۔اسی خیال کو اگر مزید پھیلا کر دیکھا جائے، تو ہر وہ چیز حق ہے جو مسلمانوں کی قوت میں اضافہ کا باعث ہو، اور ہر وہ چیز باطل ہو جاتی ہے جو ایک قوم کی قوت میں کمی کا باعث بنے۔چاہے وہ چیز حق کے مسلمہ اصولوں پر کتنی ہی پوری کیوں نہ اترتی ہو۔ چنانچہ اس طرح اخلاق ایک اضافی چیز بن کر رہ جاتی ہے اور دینی معیارات کی حیثیت ختم ہو جاتی ہے۔ دینی معیارات تو وحی کے ذریعے قائم کئے جاتے ہیں۔یعنی ان معیارات کو تخلیق کرنے میں "انسانی عقل" کو کوئی دخل نہیں ہوتا لیکن اب چونکہ قوت کا اضافہ اور کمی "خیر وشر" کا معیار قرار پاتے ہیں، لہذا قوم کے افراد وہ معیار خیر وشر وضع کرتے ہیں جو لازما ان کے "خود سے محبت (Self Love)" کا مظہر ہوں۔

اس طرح جو بھی معیارات بنائے جائیں گے وہ بنیادی طور پر نفسیات ہی کی بنیاد پر ہی بنائے جائیں گے۔ گویا قوم پرست کے دل میں "نفس کی پرستش"، لالچ، حسد اور نفرت ڈیرہ ڈال لیتی ہے۔اپنے مقاصد کے حصول میں غیر پر ظلم کرنا حق سمجھتا ہے۔ کیونکہ اس طرح غیر کی قوت میں کمی واقع ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تمام "قوم پرست تنظیمیں" متشدد ہوتی ہیں۔ قوم کی پرستش کرنے والا "مسلم قوم پرست" دعوت کے فریضے کو سرانجام نہیں دے سکتا۔ کیونکہ دعوت کا مطلب غیر کو اپنانا ہے اور اگر مطمع نظر غیر سے نفرت ہو تو اس کے خلاف سازش کرنا، اس سے حسد کرنا، جائز ہوا تو لازما اس کو اسلام کی دعوت موثر طور پر نہیں دی جاسکتی۔ اسی طرح ایک مسلم قوم پرست کا کام صرف صرف مسلمانوں کی ترقی جبکہ باقی تمام اقوام کے ساتھ حسد اور نفرت کرنا ہے کیونکہ قوم پرستی یہی سیکھاتی ہے کہ اپنی قوم کے علاوہ باقی تمام اقوام سے نفرت کی جائے۔(12)

دعوت اسلام ایک آفاقی تاریخ میں شامل ہو جانے کا نام ہے۔ جو انبیاء علیہ السلام کی دعوت کے نتیجے میں تشکیل پائی ہے۔ لیکن اسلام نہ تو کوئی تاریخی طور پر مخصوص کسی خیر (سچ) کی طرف لوگوں کو بلا رہا ہے اور نہ ہی اسلام مسلمانوں کی جاہ و حشمت کا قیام چاہتا ہے۔ بلکہ اسلام کا صرف ایک مقصود ہے اور وہ ہے "رضائے الٰہی کا حصول"۔ دعوت کی بنیاد محبت ہے، داعی کا کوئی غیر نہیں ہوتا۔ وہ ہر شخص کا خیر خواہ ہوتا ہے۔ آنحضرت ﷺ نے فتح مکہ کے بعد قریش کے ساتھ جو حسن سلوک کیا وہ ایک انقلابی اور ایک قوم پرست کی قلبی کیفیت کے بنیادی فرق کو واضح کرتا ہے۔ احیائے اسلام کی کوششوں میں مصروف عمل، جہادی تحریکوں سے وابستہ پر خلوص نوجوانوں کارکنوں کو قوم پرستی کی زہرناکی سے بچانا ہم سب کا اہم ترین فریضہ ہے۔ قوم پرستی میں صرف وہ اقدار فوقیت رکھتی ہیں، جو قوت میں اضافے کا باعث ہوں۔ اور اُن اقدار کو ناپسند کیا جاتا ہے جو قوت میں کمی کا باعث بنے۔

اس طرح معاشرے میں وہ افراد ہی بہتر خیال کیے جاتے ہیں جن کی قوت زیادہ ہو اور وہ اپنی قوم کیلئے زیادہ سے زیادہ قوت جمع کر سکیں۔ اس طرح قوم پرستی کے "شخصیت پرستی" میں مدغم ہو جانے کے امکانات بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ اور یہ قومی ہیروز اپنی قوم کو طاقتور بنانے کیلئے مذہب، اخلاقیات، انسانی جذبوں اور لطیف رویوں کو روندتا ہوا ناپائیدار قوت زیادہ سے زیادہ ارتکاز میں سرگرم عمل ہو جاتا ہے۔ جو یقیناً احیائے اسلام کی کوششوں میں مصروف قوتوں کیلئے زہر قاتل کا کام کرتا ہے۔

تجزیہ:

سب سے پہلی بات جس کا ادراک نہایت ضروری ہے کہ خواہ لبرل ازم ہو یا کمیونیٹرین کی کوئی بھی صورت (قوم پرستی ہو خواہ سوشل لازم)، ان کا ہدف ایک ہی ہے۔ یعنی حصول آزادی، گویا ہر فرد کو اس قابل بنانا کہ وہ جو چاہے وہ چاہ سکے اور اسے حاصل بھی کر سکے۔ بظاہر اشتراکیت لبرلزم پر یہ الزام لگاتی ہے کہ افراد کی آزادی کا حصول انفرادی ملکیت اور سرمایہ دارانہ نظام معیشت میں ممکن نہیں۔ لیکن روس میں پچھتر سالہ اشتراکی تجربہ نے ثابت کر دیا کہ وسائل کو قومی ملکیت میں لے کر بھی آزادی کا یہ ہدف حاصل نہ کیا جا سکا۔ روس کے عوام کی ایک بڑی اکثریت نے اشتراکیت سے برات کا اعلان کر کے اس بات کا ثبوت دیا کہ وہ سرمایہ دارنہ لبرل ازم کو حصول آزادی کا بہتر طریقہ سمجھتے ہیں۔ اور روس میں اس کے احیاء کے لیے بڑی سے بڑی قربانی دینے کو تیار ہیں۔ یہاں سے ہم انسانیت پرستی، لبرلزم اور سرمایہ داری میں ایک قدر مشترک پاتے ہیں، اور یہ تینوں نظریات ایک دوسرے کی معاونت کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ لہٰذا وہ اسلامی انقلابی نوجوان، جو ان تینوں نظریات کو (علیحدہ علیحدہ رکھ کر) جاننے کی کوشش کرتے ہیں وہ اس فطری تعلق کو نظر انداز کر بیٹھتے ہیں جو مغربی استعماریت کی اساس کا درجہ رکھتا ہے یعنی "آزادی"۔

مغربی استعماریت کی بنیاد انسان پرستی پر ہے۔یعنی انسان خود مقصود ہے اور اس دنیا میں اسکی آمد کا مقصد زیادہ سے زیادہ "لذت" اور اپنی "خواہشات" کی تکمیل ہے۔مغرب اس بات پر یکسو ہے کہ انسان پرستی صرف آزادی کے حصول کے بعد ہی ممکن ہے۔گویا دنیا میں کامیابی کے لیے آزادی کا حصول لازمی قرار پاتا ہے۔یہی وہ قدر ہے جسے حاصل کرکے انسان انسان بن جاتا ہے، لیکن مسئلہ یہ ہے کہ آزادی بذات خود کچھ نہیں ہے۔ اس کی Concrete form "سرمایہ" ہے۔اور اس کی مجرد شکل "ووٹ" ہے۔

لہذا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اگرچہ کمیونیٹرین ازم بھی (Humanism) ہی کی ایک شکل ہے تاہم انسانیت پرستی کے لیے پھلنے پھولنے کے امکانات ایک لبرل معاشرے میں کہیں زیادہ ہیں اس لئے کہ ایک لبرل معاشرے میں سرمائے کی بڑھوتری کے امکانات اشتراکی معاشرے سے کہیں زیادہ ہیں۔اور سرمایہ کی بڑھوتری دراصل آزادی کی بڑھوتری کا ہی دوسرا نام ہے۔

تصور آزادی کی اسلام کاری:(Islamization of freedom)

لبرل فکر سے متاثر مسلمان کہتے ہیں کہ آزادی کا مفہوم لوگوں کو انسانوں کی غلامی سے نکال کر خدا کا غلام بنانا ہے یہ بالکل غلط بات ہے اس کی دو وجوہات ہیں۔

1. پہلی وجہ یہ ہے، کہ آزادی کی جو تعبیری توجیہہ تاریخ میں مرتب ہوئی، اس کا مطلب انسانوں کو خدا کی غلامی سے رہا کرکے ان کو خود اپنی نفسانی خواہشات کا غلام بنا دینا ہے۔اور تاریخ نے ثابت کر دیا ہے کہ آزادی پر ایمان لانے والے، لبرل اور سوشلسٹ کبھی خدا کے بندے نہیں بنتے۔وہ ہمیشہ اپنے نفس کے بندے بنتے ہیں اور خدا سے بغاوت کرتے ہیں۔
2. دوسری وجہ یہ ہے کہ انسانوں کی غلامی سے آزادی کا مطلب اس نظام ہدایت کا انہدام ہے، جو اسلام قائم کرنا چاہتا ہے۔اسلام ایک مساویانہ معاشرہ قائم نہیں کرنا چاہتا، بل کہ ایک ایسا معاشرہ تعمیر کرنا چاہتا ہے، جہاں اہل تقوی کی فوقیت اور بالا دستی کو روحانی، سیاسی اور علمی سطح پر تسلیم بھی کیا جائے۔ اپنی چودہ سو سالہ تاریخ میں اسلامی معاشرہ ایک درجہ بند معاشرہ رہا ہے۔(13)

درجہ بند معاشرت تنظیم کا دوسرا جو از اسلامی نظام ریاست ہے، یہاں سلطان ظل اللہ ہوتا ہے اور ملک کے باقی تمام اس کے رعایا ہوتے ہیں۔عوام کی حکومت میں شمولیت کا کوئی جواز نہ امام ماوردی نے کبھی پیش کیا، نہ امام ابن خلدون نے نہ شاہ ولی اللہؒ نے۔سلطان عوام کا نمائندہ ہوتا ہے نہ عوامی نمائندگی کی اداراتی صف بندی کا کوئی تصور اسلام میں موجود ہے۔سلطان صرف اللہ کا مطیع ہوتا ہے۔عوام کی رائے کی بنیاد پر کوئی فقہی یا ریاستی فیصلہ نہیں کیا جاتا۔

اسلام آزادی کو بہ حیثیت ایک قدر کے مکمل رد کرتا ہے۔ اور ہر جمعہ میں امام مسجد اعلان کرتا ہے۔"**وینهی عن الفحشاء والمنکر و البغی**" آزادی، بغی، کی جدید سیاسی شکل ہے اور اسلامی انقلاب اسی بغاوت کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم کرنے کے لیے برپا کیا جاتا ہے۔[14]

برابری(equality)

مغربی استعماری فکر کا اصل عقیدہ تو آزادی ہے، اُسی عقیدے میں سے مغربی استعماری فکر کے دوسرے عقائد جنم لیتے ہیں۔ آزادی میں جب ہر انسان کو خیر اور شر کے تعین کا اختیار ہوتا ہے، بلکہ اس سے بھی آگے حق اور شر کی تشریح کا حق ہوتا ہے، تو لازمی طور پر ہر انسان کے حق اور شر کو برابر قرار دیا جاتا ہے، برابری کی یہ قدر سیاسی، معاشی اور معاشرتی ہر سطح پر پائی جاتی ہے اگر کسی بھی انسان کے حق یا شر کے معیار کو غلط کہیں گے نہ تو وہ برابری ہوگی اور نہ ہی آزادی، اس لیے آزادی کو برقرار رکھنے کیلئے ہر شخص کے تصور خیر اور تصور شر کو برابر قرار دینا ضروری ہے، جیسا کہ ایک لبرل اسٹیٹ، ہیومین رائٹس سیٹزنز کو مساویانہ طور پر فراہم کرنے کی پابند ہے اور اس کا دستور اس بات کی گارنٹی دیتا ہے کہ ہر سٹیزن مساویانہ طور پر ان حقوق اور فرائض کا مکلف ہے، اسی چیز کو(Rule of Law)کہتے ہیں، جو کہ حقیقت میں(Rule of Law of Capital)ہے۔[15]

سادہ لفظوں میں مساوات کا مطلب ہے "نظام ہدایت" کا انکار کرنا، یعنی اس بات کا انکار کرنا کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو خیر و شر بتانے کے لیے ہدایت کا کوئی سلسلہ انبیا اکرامؑ کے ذریعے قائم کیا ہے اور انبیا اکرامؑ کی تعلیمات خیر و شر طے کرنے کا کوئی حتمی معیار ہے یہ اس لیے کہ نظام ہدایت کا مطلب ہی یہ ہے کہ تمام انسانوں کی خواہشات ہرگز مساوی حیثیت نہیں رکھتیں بلکہ وہ شخص جس کی خواہشات انبیاؑ کی تعلیمات کا مظہر ہیں تمام خواہشات پر فوقیت رکھتی ہے۔[16]

ترقی(progress)

ترقی سے مراد پراگرس ہے، اور پراگرس کا عقیدہ سرمایہ دارانہ فکر کی امتیازی خصوصیت ہے۔ سرمایہ دارانہ علمیت کے غلبے سے پہلے کسی نظام فکر نے نہ آزادی کو بہ حیثیت ایک عقیدہ کے قبول کیا، نہ پراگرس کو۔ پراگرس، آزادی کا لازمی لاحقہ ہے۔ ترقی سے مراد صرف یہ ہے کہ سرمایہ کی بڑھوتری میں لامتناہی اور مسلسل اضافہ مستقل ہوتا رہے۔

آزادی کا عقیدہ رکھنے والا شخص اس بات پر ایمان لاتا ہے، کہ ہیومین بینگ(human being)وہ ہے جو صرف اپنی خواہشات نفسانی کے حصول کی مستقل جدوجہد کرنے کو عقل کے واحد تقاضے کے طور پر قبول کرے۔ وہ صرف اپنے نفس کا بندہ ہو۔ اس کو(Autonomy) خود کفالت کہتے ہیں۔ ایک اٹانومس ہومین بینگ اپنی خواہشات نفسانی کے حصول کی جدوجہد اس طرح کرتا ہے۔ کہ تمام اٹانومس بھی اپنی جدوجہد بلا غیر ضروری روک ٹوک جاری رکھ سکیں۔

اس عقیدے کی سب سے واضح توجیہ (نظریہ افادیت) نے پیش کی ہے۔(نظریہ افادیت) فلسفہ سرمایہ دارانہ علم اکنامکس کو بنیاد فراہم کرتا ہے۔ اس نظریے کا پہلا بڑا مفکر، ہیوم، تھا(جو، ایڈم اسمتھ، کا قریبی دوست تھا)۔ انیسویں صدی میں سب سے نمایاں، بینتھم اور، جان اسٹورٹ مل، تھے۔[17]

(نظریہ افادیت) کے مطابق انفرادی اور اجتماعی زندگی کا مقصد لذت کو مستقلاً انتہائی فروغ دینا ہونا چاہیے۔ جو نفسانی خواہشات کی تسکین سے حاصل ہوتی ہے۔ اور نفس کی تسکین کا واحد ذریعہ (consumption) صرف ہے، لہذا معاشی اور معاشرتی پالیسی کا واحد معقول ہدف مجموعی معاشرتی 'صرف' کو لامتناہی اور مستقل بڑھانا ہے۔ (صرف) میں اضافے کو ناپنے کے لیے علم اکنامکس نے جو پیمانہ وضع کیا ہے اس کو گرانس نیشنل پروڈکشن (جی این پی) اور گراس نیشنل ایکس پنڈیچر کہتے ہیں۔ عملاً ترقی سے مراد جی این پی یعنی مجموعی معاشرتی (صرف) میں اضافے کے علاوہ کچھ نہیں۔ اکنامکس کی وہ شاخ جسے ویل فیئر اکنامکس کہتے ہیں، اصرار کرتی ہے، کہ ترقی کو ناپنے کے لیے، جی این پی، کی معاشرتی تقسیم کو بھی ملحوظ خاطر رکھنا چاہیے۔ ترقی کو ناپنے کے لیے محض مجموعی معاشرتی، لذات، (جی این پی) میں لامتناہی اضافہ کافی نہیں، بل کہ یہ بھی ضروری ہے کہ جی این پی، کی تقسیم ایسی ہو کہ تمام افراد اور گروہ لذات کے اضافے سے مستفید ہوتے رہیں۔ یہی سرمایہ دارانہ عدل ہے، اور اس کی سب سے واضح تشریح جان رالز نے اپنے مشہور، ڈفرنس پرنسپل میں کی ہے، اور ایک فی زمانہ مشہور عالم تشریح "امرتیا سین" کی کتاب Development as Freedom میں ملتی ہے۔ واضح ہو کہ ترقی سے مراد حصول لذت کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ لذت کے حصول کا ذریعہ سرمایہ ہے۔ لہذا ترقی کا حصول (Accumulation of Capital) سرمایہ کی بڑھوتری کے ذریعے ہی ہوتا ہے۔

خلاصہ بحث ونتائج

مغربی استعماریت کی فکری بنیادوں کے اس مختصر خاکے سے ہم اس بات کی نشاندہی کرنا چاہتے ہیں، کہ اشتراکیت اور لبرلزم کا ہدف ایک ہی ہے، یعنی زیادہ سے زیادہ آزادی کا حصول۔ اشتراکت کا دراصل لبرلزم پر اعتراض ہی یہ ہے کہ اس سیاسی، ریاستی اور معاشی سماجی ڈھانچے میں حصول آزادی ممکن نہیں، لیکن روس میں اشتراکیت کی شکست سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے، کہ آزادی کے حصول کی خواہش کی تکمیل کے لئے لبرلزم اور سرمایہ داری جو سیاسی اور معاشی نظام وضع کرتے ہیں وہ ایک دوسرے کے ساتھ منسلک اور مربوط ہیں اسلامی نقطۂ نگاہ سے لبرلزم اور کمیونیٹریئرزم دونوں میں کوئی اقداری فرق نہیں۔

الغرض اس سے ہمارا مقصد یہ واضح کرنا تھا، کہ تصورات کو اگر ان کے تاریخی تسلسل سے کاٹ کر دیکھا جائے، تو اس بات کا شدید احتمال رہتا ہے، کہ ہم ان تصورات کے اندرونی تفرقات کو بالکل نظر انداز کر دیں، جو اس تصور کی، زہرناکی، کو ہم پر آشکار کر ڈالنے کی صلاحیت رکھتے ہوں، یا پھر ان اندرونی تفریقات میں پھنس کر رہ جائیں گے، اور تصور کا مجموعی تاثر

ہماری نظروں سے اوجھل ہو جائے گا، مغربی استعمار کے ان تصورات کے اس تاریخی عدم تسلسل یا دوسرے معنوں میں توضیح کا نتیجہ یہ نکلا، کہ ہم نے ان غیر اسلامی اقسام کے لئے اسلامی بنیادیں فراہم کرنا شروع کر دیں، مغربی تصورات مثلاً لبرلزم (liberal)، قوم پرستی، انسان پرستی، اشتراکیت وغیرہ کو اگر تاریخیت میں ان خاص سیاسی، سماجی، معاشی اور ریاستی صف بندی میں دیکھیں، جو ان تصورات کے معنی و مطالب کے ادارک کے لیے ضروری اور نامیاتی طور پر منسلک ہے، تو یہ سمجھ لینا کچھ مشکل نہیں کہ ان تصورات کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔

استعماریت کے فکری متاثرین مسلمانوں کو یہ بات ایک آنکھ نہیں بھاتی کہ ہم مسلمانوں کا سب سے اچھا دور تو دور نبوی ﷺ اور دور صحابہ رضی اللہ عنہم اور صلف صالحین کا دور تھا، جو کہ گزر چکا ہے اور اب ہر آنے والے دور پہلے سے بہتر نہیں بلکہ برا ہو گا جیسا کہ احادیث مبارکہ میں بیان کیا گیا ہے وہ کہتے ہیں کہ مولوی ہمیں پیچھے کی طرف لے کر جانا چاہتا ہے. اور اس میں شک بھی کیا ہے کہ مولوی تو یہی چاہتا ہے کہ دنیا کسی طرح پھر ویسی ہو جائے جیسے آقا دوعالم ﷺ کے دور میں تھی۔ اسی جرم میں مولوی پر دقیانوسی اور تنگ نظر ہونے کی پھبتی کسی جاتی ہے کہ یہ تو ترقی کا دشمن ہے اور یہ دنیا کو پھر پتھر کے دور میں واپس لے جانا چاہتا ہے۔[18]

یہ بالکل ممکن ہے کہ مغربیاستعماری تصور، برداشت، کو آپ اسلام کے تصور، صبر، کے مماثل کر لیں، اور اس کی حمایت میں قرآن و حدیث کو بھی بطور دلیل پیش کر دیں، لیکن یہ ان تصورات کی مجرد تفسیر نہ ہو گی، اور ان ہی علمی بنیادوں پر استوار ہو گی، جو کہ غالب اکثریت کی عقلیت سے مطابقت رکھتی ہوں، اس طرز فکر کا لا محالہ یہ نتیجہ نکلے گا، کہ آپ اسلام کو مغربی اقسام (forms) میں ٹھونستے چلے جائیں گے، اور اس کو عین عبادت بھی سمجھتے جائیں گے، اس تناظر میں اگر ہم 1857ء سے لے کر آج تک اپنی جدوجہد پر نگاہ ڈالیں، تو ہم پر یہ بات واضح ہو جاتی ہے، کہ کوئی اسلامی انقلابی تحریک بھی مغربی استعماری فکر کے اثر سے محفوظ نہیں رہ سکی، اور ہم نے بہت سے ایسے اسلامی جواز (اسلامی علمیت کی بنیاد پر) پیش کیے، جن کے سہارے میں جمہوریت، حقوق کی سیاست، سیکولرازم، مقننہ آئین وغیرہ جیسے تصورات اسلامی سیاست کا جزو تصور ہونے لگے، اور ان کو خالص اسلامی تصورات کے یا بعض معنی میں غیر اقداری تصور کر لیا گیا، اس بات کا ادراک نہایت ضروری ہے، کہ بنیادی طور پر غیر اسلامی اقسام کے ذریعے غلبہ اسلام ممکن نہیں ہو سکتا اس لئے کہ ان اقسام (Forms) کو استعمال کرنے کے نتیجے میں ایک خاص قسم کی علمیت عقلیت، تصور کائنات، تصور انسان تشکیل پاتا ہے جو کہ لا محالہ اسلامی تصورات سے متصادم ہے اور جو کہ استعماریت کے فکری غلبہ کے نتیجہ میں پیدا ہونے والے تصورات کی عکاسی کرتا ہے۔

This work is licensed under a Creative Commons Attribution 4.0 International License.

حوالہ جات(References)

[1]۔ انصاری، جاوید اکبر، ڈاکٹر، **سرمایہ درانہ عقائد و نظریات**،(وراثت پبلی کیشنز غزنی سٹریٹ اُردو بازار لاہور،2014)، ص24

[2]۔ محبوب الحسن، سید، **سرمایہ درانہ نظام ایک تنقیدی جائزہ**،(وراثت پبلی کیشنز غزنی سٹریٹ اُردو بازار لاہور،2014ء)، ص40

[3]۔ **سرمایہ درانہ نظام ایک تنقیدی جائزہ**، ص41

[4]۔ عسکری، محمد حسن، **جدیدیت**،(ادارہ مطبوعات طلبہ،لاہور، ستمبر2013ء)، ص53

[5]۔ **جدیدیت**، ص28

[6]۔ **جدیدیت**، ص69

[7]۔ محبوب الحسن، سید، **سرمایہ درانہ نظام ایک تنقیدی جائزہ**، ص44

[8]۔ خالد، جامعی، سید، **افکار مغرب کا تنقیدی جائزہ**، ماہنامہ ساحل، شمارہ15، مارچ،2007، کراچی، ص14

[9]۔ انصاری، جاوید اکبر، ڈاکٹر، **سرمایہ درانہ عقائد و نظریات**،(وراثت پبلی کیشنز غزنی سٹریٹ اُردو بازار لاہور،2014)، ص31

[10]۔ خالد، جامعی، سید، افکار مغرب کا تنقیدی جائزہ، ماہنامہ ساحل، شمارہ15، مارچ،2007، کراچی، ص12

[11]۔ مودودی، ابو الاعلیٰ، سید، **اسلام اور جدید معاشی نظریات**،(اسلامک پبلی کیشنز لمیٹڈ، ای شاہ عالم مارکیٹ، لاہور)، ص46

[12]۔ انصاری، جاوید اکبر، ڈاکٹر، **سرمایہ درانہ عقائد و نظریات**، ص54

[13]۔ **سرمایہ درانہ عقائد و نظریات**، ص25

[14]۔ **سرمایہ درانہ عقائد و نظریات**، ص20

[15]۔ **سرمایہ درانہ عقائد و نظریات**، ص25

[16]۔ زاہد صدیق، مغل، **سوشل سائنسز، جمہوریت اور اسلامی بینک کاری**،(لیکسی بکس انٹر نیشنل لاہور)، ص21

[17]۔ انصاری، جاوید اکبر، ڈاکٹر، **سرمایہ درانہ عقائد و نظریات**، ص27

[18]۔ زاہد صدیق، مغل، سوشل سائنسز، جمہوریت اور اسلامی بینک کاری، لیکسی بکس انٹر نیشنل لاہور، ص31